۱

تہذیبوں کا تصادم ــــ اکیسویں صدی میں!

آج سے کوئی دس برس پہلے امریکی وزارت خارجہ کے سابق پلاننگ چیف فرانسس فوکویاما (Francis Fukuyama) نے ''تاریخ کا نقطۂ انتہا'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر بحث کا دروازہ کھول دیا اور ساری دنیا کو ششدر کر دیا۔ اس مضمون میں پیشین گوئی کی گئی تھی کہ تہذیب کا مغربی ماڈل ساری دنیا پر چھا جائے گا۔ اس کے بعد سات سال قبل سیموئیل ہنٹنگٹن (Samuel Huntington) نے فوکویاما کے تصور کو رد کرتے ہوئے بالواسطہ ''تہذیبوں کے تصادم'' کی پیشین گوئی کی اور مسلمانوں کو پہلے سے بھی زیادہ چونکا دیا۔ ماہرین عمرانیات، ماہرین ثقافت، مورخین، مستشرقین اور علم سیاسیات کے ماہرین اب تک ان دونوں مفروضوں پر اپنے ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں۔

ہنٹنگٹن کا اصرار ہے کہ اس نے ایسی پیشین گوئی نہیں کی جو اپنے اندر تکمیل کے سارے امکانات رکھتی ہو، بلکہ فی الحقیقت تہذیبی تصادم کو ابھی برپا ہونا ہے۔ لیکن بہ قول محب الرحمٰن امریکی پروفیسر نے ''تصورات کے تصادم'' کو یقیناً ہوا دی ہے۔ بہ الفاظ دیگر اسے فکری و ذہنی کاوشوں کی باہمی تخم ریزی کہا جا سکتا ہے۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایسی پیشین گوئیاں حقیقت کا روپ نہ دھاریں تو ہمیں اپنے مقالوں کو ''تہذیبوں کے تصادم'' (The Clash of Civilizations) جیسے عنوانات سے سجانا نہیں چاہیے، اس لیے کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ تصادم ناگزیر ہے۔ اس کے بجائے بہتر ہوگا کہ اس کا ذکر ''تہذیبوں کا ایک تصادم'' (A Clash of Civilizations) کے الفاظ سے کیا جائے۔

مغرب کے علمی حلقوں میں بھی ہنٹنگٹن پر تنقید کی بوچھاڑ ہوئی اور مشکل ہی سے اس کی تحسین کی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ''فارن افیئرز'' کے (موسم سرما ۱۹۹۳ء) اگلے ہی شمارے میں ساتوں کے ساتوں تبصرہ نگاروں نے شدت کے ساتھ ہنٹنگٹن سے اختلاف کیا۔ اس کے بعد ہی ہنٹنگٹن اپنی پوزیشن واضح کر پائے اور بعض غلط تاثرات دور کر سکے ہیں۔ اس بحث میں حسب ذیل نکات اہم ہیں:

(الف) جہاں تک مغربی ثقافت کی فتح اور عالمی غلبے کا تعلق ہے ہنٹنگٹن فوکویاما کے مقابلے میں پرامید نہیں۔ ان کے خیال میں ہوسکتا ہے کہ مغربی دنیا بل گیٹ کے حیران کن سائنسی آلات (gadgets) اور ہر شخص کو کوکا کولا کا عادی بنا کر ساری دنیا کو اپنے جال میں لے آئے، لیکن اس سے کلچر کے مظاہر یعنی زبان، تاریخی شعور، تاریخی یادداشتوں اور مذاہب کا متاثر ہونا لازم نہیں آتا۔ ہنٹنگٹن کی نظر میں دنیا زیادہ وسیع المشرب اور ہم رنگ نہیں ہو رہی بلکہ نسبتاً علاقائی اور نسلی نقطہ نظر اختیار کر رہی ہے جہاں نسلی تفاخر ہر جگہ فروغ پذیر ہے۔ لہٰذا ہنٹنگٹن کا مفروضہ یہ ہے کہ ''مغرب منفرد ضرور ہے، عالم گیر نہیں۔'' میں یہاں اسی عنوان سے ان کے ایک مضمون سے اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا: ''عالم گیریت (Universalism) کا لازمی اور منطقی نتیجہ استعماریت (Imperialism) کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اگر اس تصور کو کہ تمام دنیا کے لوگوں کو مغربی اقدار، ادارے اور کلچر اپنا لینا چاہئیں، سنجیدگی سے لیا گیا تو اس کے اطلاقی نتائج غیر اخلاقی ہوں گے--- ابھرتی ہوئی باہمی طور پر ہم آہنگ اور عالمی سطح پر غالب مغربی دنیا--- ایک گمراہ کن، متکبرانہ، جھوٹا اور خطرناک تصور ہے!''

(ب) پہلی وضاحت سے مطابقت رکھنے والی دوسری وضاحت جدیدیت (Modernization) اور مغربیت (Westernizaton) کے درمیان رشتے سے تعلق رکھتی ہے۔ واضح رہے کہ مصطفیٰ کمال یہ سمجھتے تھے کہ ترکی کو مغربی رنگ میں رنگے بغیر جدید نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کے بعد کئی دوسری

حکومتوں نے بھی اسی مفروضے اور تصور کی پیروی کی۔ یہاں پھر ہنٹنگٹن اختلاف کرتے ہوئے اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ روایتی معاشرے اور جدید معاشرے لازمی طور پر یکساں نہیں ہوتے جیسا کہ جاپان، سنگاپور اور سعودی عرب کی مثالوں سے ظاہر ہے کہ معاشرہ اپنا کلچر برقرار رکھتے ہوئے بھی پیداوار کے جدید طریقے اختیار کرسکتا ہے اور یہ بات ممکن ہے۔ محمد اسد کے صاحبزادے طلال اسد کہتے ہیں کہ ''روایت اور جدیدیت لازمی طور پر معاشرے اور کلچر کی متعارض صورتیں نہیں ہیں بلکہ یہ تاریخیت کے مختلف پہلو ہیں[۲]۔'' اس طرح ہنٹنگٹن کہتا ہے: ''مغرب، جدید بننے سے پہلے بھی مغربی تھا[۳]۔'' وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ''بیشتر دنیا جدید زیادہ اور مغرب زدہ کم بنتی جارہی ہے[۴]۔''

۱۹۹۶ء میں جب پروفیسر ہنٹنگٹن پہلی بار سعودی عرب آئے، میں ریاض میں تھا۔ اس وقت انہیں ''تہذیبوں کا تصادم'' لکھے ہوئے تین برس گزر چکے تھے۔ ظاہر ہے انہیں ذرا دیر سے لیکن اس وقت یہ احساس ہوا کہ تجدد (Modernity) اور اسلام میں ایک ہم آہنگی اور مطابقت پائی جاتی ہے۔

(ج) مکالمے اور مباحث کے دوران ایک تیسرا نکتہ بھی ابھر کر سامنے آیا۔ وہ یہ کہ ہنٹنگٹن کا نظریہ، خونی سرحدوں اور تصادمات کے ذکر کے باوجود، جارحانہ نہیں ایک مدافعانہ نظریہ ہے۔ امر واقعی یہ ہے کہ ان کے خیال میں نہ صرف یہ کہ مغربی ثقافت پسپائی کی طرف گامزن ہے اور امریکی غلبہ سمٹ رہا ہے، بلکہ انہیں یہ تشویش ہے کہ احیائے اسلام ۵ کے ابھرتے ہوئے امکانات کے پس منظر میں مغربی کلچر کا تحفظ کیسے کیا جائے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ۱۹۹۷ء میں جرمن اخبار ''ڈائی ویلٹ'' میں ان کا جو مضمون شائع ہوا اس کا عنوان تھا، ''مغرب ابھی ختم نہیں ہوا'' (The West is not yet lost)۔ کیا آپ اس میں جارحیت کی بو محسوس کرتے ہیں؟

تصورتاریخ کی بحث

اس ابتدائی وضاحت کے بعد میں چاہتا ہوں کہ ہنٹنگٹن کے مقدمے کو چھوڑ کر اس کی اور فوکویاما کے مضحک تصورتاریخ میں چھیڑی گئی بحث کے بنیادی موضوعات پر بات کروں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آیا اسلامی تہذیب فی الواقع کوئی چیز ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو کیا یہ جوہری اعتبار سے دوسری تہذیبوں سے مختلف تہذیب ہے؟

(الف) میں آخری آدمی ہوں گا جو ساری مسلم دنیا کے خصوصی مشترک خدوخال کے وجود سے انکار کرے۔ ہوسکتا ہے کہ اسلامی آرٹ کی تعریف کے ذریعے اسے اسلامی ثابت کرنا آسان نہ ہو، لیکن ایک بچہ بھی مسلمان ہنرمندوں کی بنائی ہوئی چیزوں کی نشاندہی کرسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن، سنت، عربی زبان اور حج کا تجربہ تمام مسلمانوں کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔

اس کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ یہ تہذیب ایک مفرد اور غیر مرکب وجود کی حامل نہیں بلکہ متنوع ہے۔ ہندستان، ملائشیا، انڈونیشیا، مراکش، ترکی اور مصر میں یہ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلم اقوام نے کس قدر کامیابی سے سابقہ تہذیبوں کا بیشتر حصہ اپنے اندر سمولیا ہے اور اس طرح ان کا اپنا اپنا اسلامی کلچر وجود میں آیا ہے جس میں بالخصوص غذا، لباس، معاشرتی اقدار اور زبانیں شامل ہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ اس امر کا امکان زیادہ ہے کہ تصادم ایک خاص اسلامی تہذیب سے ہو، بحیثیت مجموعی اسلامی تہذیب سے ہرگز نہیں ہوسکتا۔

(ب) ہمیں اس مفروضے کو سختی سے مسترد کر دینا چاہیے کہ مسلم ثقافت جوہری اعتبار سے دوسری ثقافتوں سے مختلف ہے۔ ثقافت کے بارے میں جوہری اختلاف کا تصور دقیانوسی تصور ہے، جسے ایڈورڈ سعید نے اپنی دونوں کتابوں، ''اورینٹلزم'' [*Orientalism* (۱۹۷۸ء)] اور ''کورنگ اسلام'' [*Covering Islam* (۱۹۸۱ء)] میں رد کیا ہے۔

ہم مسلمانوں پر نگاہ ڈالنے کا یہ زاویہ نظر کوئی نیا نہیں۔ والٹیئر (Voltaire)، ہیگل (Hegel) اور میکس ویبر (Max Weber) کے زمانوں سے اسلام کی تعریف مغربی تہذیب کے ماڈل کے مقابلے میں اس کی ''خامیوں'' اور امتیازی پہلوؤں کے حوالے سے کی جاتی رہی ہے۔ گویا مسلمانوں میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ دستوری طور پر انفرادیت، مدنی شعور یا تعقل پسندی کی حمایت کر سکتے[۶]۔ میکس ویبر کی نظر میں اسلام ایک ''جنگی مذہب'' (war religion) ہے۔ مشرقی استبدادیت گویا ایک موروثی عارضہ ہے۔ گستاف وان گرونبام (Gustave Von Grunebaum) کے نزدیک اسلامی کلچر ایک ''ایسی دنیا ہے جو ہمارے یعنی مغرب کے بنیادی جذبوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتی[۷]۔''

قدرے قریبی دور میں اسلام کو ایک جنگجو مذہب کے طور پر پیش کیا گیا اور شرق اوسط کو ایک بحران زدہ علاقہ - صرف اس وجہ سے کہ مغرب کی نگاہیں تیل اور اسرائیل پر مرتکز ہیں۔ ایڈورڈ سعید کی زبان میں ''تیل اور بحران'' (Oil and Turmoil) کا علاقہ[۸]۔ آج کل عربوں کو ''ارب پتی، بم دھماکے کرنے والے اور بیلے ڈانسر'' کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے[۹]۔ دوسروں کو شیطانی طریقے سے ایسا روپ دینا کہ وہ مستقلاً غیر نظر آئیں، کلچر کا جدید فیشن ہے[۱۰]۔ دنیا میں وجوہ اختلاف دیکھتے رہنا اور ہم آہنگی کی صورتیں بھول جانا شاید کمپیوٹر ٹکنالوجی کی شیطانی فطرت ہے --- یعنی چیزیں صفر ہیں یا ایک، کالی ہیں یا سفید، مغربی ہیں یا مشرقی۔

تاہم اسلام مغرب کے من پسند دشمن کے امیج کا کام دے سکتا ہے، اس لیے نہیں کہ اسلام مغرب کے لیے بہت اجنبی ہے، بلکہ اس لیے کہ یہ مغربی تہذیب کے بنیادی خدوخال سے بہت ملتا جلتا ہے[۱۱]۔ ہنٹنگٹن نے خود اعتراف کیا ہے کہ اسلام میں تشدد کا عنصر کسی دوسرے مذہب سے زیادہ نہیں[۱۲]۔

تصادم ـــ قومی سرحدوں پر یا ثقافتی سرحدوں پر؟

اس کے بعد سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ یہ مفروضہ کہاں تک درست ہے کہ مستقبل میں تصادم قومی سرحدوں پر نہیں ثقافتی سرحدوں پر ہوں گے۔

(الف) مجھے یہ مفروضہ مشکوک لگتا ہے کیونکہ غالباً اس کی وجہ یہ مشاہدہ ہے کہ معاملات پر قومی ریاستوں کا کنٹرول کم سے کم ہو رہا ہے۔

مثال کے طور پر اگر قومی اقتصادی پالیسیاں بین الاقوامی رجحانات کے خلاف ہوں تو گلوبلائزیشن انہیں عملاً ناکام بنا دیتی ہے۔ مالیاتی پالیسی، شرح سود، ٹیکسوں، کم از کم معاوضوں اور اس طرح کے دوسرے معاملات میں اب کوئی ملک خودمختار (sovereign) نہیں رہا۔ نہ صرف یہ کہ یہ معاملات اب زیادہ تر یورپی یونین یا ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن جیسی تنظیمیں کنٹرول کرتی ہیں بلکہ بین الاقوامی مالیات چلانے والے انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا میں کہیں بھی ایک سے دوسری جگہ سرمایہ منتقل کر کے مقامی اقتصادیات کو برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ملائشیا کا تلخ تجربہ اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آئندہ فوجی تصادم، سپر پاورز، چھوٹی طاقتوں اور ان کے فوجی حلیفوں کے درمیان نہیں بلکہ تہذیبوں کے درمیان، پیش آئیں گے۔

(ب) ثانیاً میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ کے ہر دور میں فوجی تصادم، تہذیبی امتیازات یا مختلف ثقافتوں کی باہمی ٹکراتی اقدار کی بنیاد پر ہی پیش آئے۔ جنگ عظیم اول اور دوم صرف برطانوی، فرانسیسی اور جرمن قوموں کے درمیان ہی نہیں لڑی گئیں بلکہ یہ برطانوی، فرانسیسی اور جرمن ثقافتوں کے درمیان بھی تھیں جو آج کے مقابلے میں اس وقت نمایاں طور پر ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ حتیٰ کہ امریکی خانہ جنگی بھی دو ثقافتوں یعنی ''یانکی'' اور ڈکسی'' کے درمیان ہوئی۔ جنوب نے بزعم خویش اپنے اعلیٰ شریفانہ طرز زندگی کی خاطر لڑائی لڑی، جبکہ نسلی برتری کا یہ تصور شمال میں ناپید تھا۔

کیا تہذیبوں کا تصادم ناگزیر ہے؟

اس پس منظر کو سمجھنے کے بعد اب ہم تہذیبوں کے درمیان ''تصادم'' کے نظریے کو چیلنج کر سکتے ہیں۔ یہ نظریہ بلاشبہ عجیب وغریب ہے۔ جہاں تک پیچھے مڑ کر دیکھا جا سکتا ہے، تہذیبوں کے ارتقاء میں کبھی کوئی زیرو پوائنٹ نہیں ہوتا۔ دنیا میں ہر شخص نے کسی دوسرے شخص سے فیض پایا اور ہر شخص نے کسی دوسرے شخص کی کامیابیوں پر عمارت کھڑی کی۔ یہ حقیقت ہندوستانی ہندسوں کے مغرب کی جانب سفر سے واضح ہے، جنہیں یورپ میں ہم عربی ہندسے کہتے ہیں، اگرچہ عربوں نے ان میں صفر کے ہندسے (جو بلاشبہ نہایت اہم ہے) کے سوا کوئی اضافہ نہیں کیا۔

یہ بات خصوصاً توجہ طلب ہے کہ بحیرہ روم جس کے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ مغرب کی فرنگی دنیا اور جنوب اور مشرق کے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے، وہی ہمیشہ پل کا کام بھی دیتا رہا ہے۔ عین صلیبی جنگوں کے دور میں بھی ثقافتی عمل وتعامل اور باہمی تخم ریزی کا عمل جاری رہا۔ میں چند حیران کن مثالوں سے اس بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔

- قیطلونہ کے مذہبی فلسفی ریمانڈس لولوس (۱۲۳۲ء-۱۳۱۶ء) نے مسلم دنیا کے ساتھ امن کو فروغ دینے کی غرض سے بطور مسیحی مشنری کے مسلم صقلیہ اور شمالی افریقہ کا سفر کیا۔ اسے کسی نے کوئی نقصان نہ پہنچایا۔
- ذرا تصور کیجیے کہ پانچویں کروسیڈ کے رکن کے طور پر سینٹ فرانسس (۱۱۸۲ء-۱۲۲۶ء) نے شرق اوسط کا سفر اختیار کیا۔ اسے ۱۲۱۹ء میں سلطان الملک الکامل کے روبرو تبلیغ کی اجازت دی گئی۔
- جرمن بادشاہ فریڈرک دوم نے جو عربی زبان بول سکتا تھا اور جسے مسلم سائنسدانوں کی صحبت حاصل تھی، ۱۲۲۹ء میں سلطان الملک کے مہمان کی حیثیت سے بحفاظت القدس کا سفر کیا اور فرمائش کی کہ اس کی موجودگی میں اذان دی جائے۔
- لیوافریقانی (۱۴۹۰ء-۱۵۵۰ء) جو ایک اندلسی مسلمان تھا، روم میں پوپ کا مشیر بنا۔

• صلاح الدین ایوبی جس نے بالآخر صلیبیوں کو شکست دی، مغربی دنیا میں شجاعت، دیانت داری اور علم دوستی کا افسانوی کردار بن کر مشہور ہوا۔

• ''کلیلہ ودمنہ'' کی حکایتیں بھی ''الف لیلہ'' کی ہزار داستان کی طرح مغربی دنیا میں عام ہوئیں۔

• دانتے نے اپنی ''ڈیوائن کومیڈی'' (Divina Comedia) کی تفصیلی تشکیل کے لیے واقعہ معراج کو سامنے رکھا۔

• ابن طفیل کے فلسفیانہ ناول ''حیی بن یقظان'' کو مغرب میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور ڈینیل ڈیفو نے ''رابنسن کروسو'' میں اس کی بھونڈی نقل بھی کی۔

• اندلس کی عشقیہ شاعری (مواشحات) اور ابن حزم کی ''طوق الحمامہ'' (بلبل کا ہار) فرانسیسی درباری گیتوں کا پیش خیمہ بنی۔

فلسفے، قدرتی سائنسی علوم، فن تعمیر، زراعت اور فنون کے شعبوں میں اسلام کے ثقافتی اثرات کا کھوج لگانا اور بھی آسان ہے۔ گیلن کی تحریریں عربی تراجم کے ذریعہ اٹلی میں پہنچیں۔ ابن رشد کی شرحوں کی بدولت ہی پیرس میں ارسطو کو از سرنو دریافت کیا گیا۔ جدید تاریخ نویسی اور عمرانیات کے حوالے سے ابن خلدون کے مقدمے سے مغربی دنیا قدرے دیر سے واقف ہوئی۔ گرجا گھروں کی گوتھک طرز کی محراب بھی فی الاصل مشرقی ہے۔

۱۸ویں صدی میں والٹیئر، لیسنگ، پروشیا کے فریڈرک دوم اور گوئٹے نے علم دشمن عناصر اور غلط کار مسیحی پادریوں کے تسلط کے خلاف لڑائی میں اسلام سے بڑی مدد لی۔ وسطی یورپ میں چرچ کی چیرہ دستیوں کے خلاف جدوجہد میں اسلام نے عقلی ہتھیار کا کام دیا۔

آج بھی مغربی کلچر کے ارتقاء میں مغربی عنصر اور مسلم دنیا کے اثرات کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ مغربی تہذیب صرف یہود و نصاریٰ کی تہذیب ہرگز نہیں، یہ یہودیت، مسیحیت اور اسلام کا آمیزہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سارے عرصے میں جو جنگیں اور تصادم ہوئے ان کا سبب مفادات کا ٹکراؤ تھا یا معاشی اور علاقائی تنازعے۔ لیکن کیا اس دوران میں ثقافتی تصادم پیش آئے؟ سوال یہ ہے کہ تاریخ کے اس طویل دور میں مسیحی اور اسلامی تہذیبوں کا آپس میں تصادم کب ہوا؟

مغرب کی اصل تشویش: اسلامی عالمگیریت کا خطرہ

سیموئیل ہنٹنگٹن غلط ہوسکتا ہے لیکن وہ احمق ہرگز نہیں۔ لہٰذا ہم آسانی سے یہ فرض کر سکتے ہیں کہ تاریخی صورتحال کو جہاں ''تہذیبوں کے تصادم'' کا نام دینا غلط ہوسکتا ہے، اس نے ایک ایسی چیز کی طرف اشارہ کیا جو حقیقی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ (۱) عمومی طور پر مذہبی عالم گیریت اور (۲) خصوصی طور پر ہم عصر اسلامی عالم گیریت کے اطلاقی نتائج کا اندازہ لگالیا۔

جہاں شرک اور کثرت پرستی ہر قبیلے یا قوم کو اپنے خاص دیوتا سے دلی رشتہ جوڑنے کی اجازت دیتی ہے، وحدانیت یعنی ایک خدا پر ایمان رکھنا--- ناگزیر طور پر عالم گیر ہے اور اسی بنا پر وسعت پذیر ہے۔ لہٰذا ہر توحیدی مذہب دوسرے مذہب کے لیے خطرے کا باعث ہے۔

اس زاویہ نظر سے اسلام ایک ایسا عالمگیر مذہب ہے جس کا کوئی مدمقابل نہیں۔ مسلم نقطہ نظر کے مطابق ہر وہ شخص، جو اللہ کی اطاعت تسلیم کرتا ہے، مسلمان ہے اور عبودیت یعنی ''الاسلام'' وہ رویہ ہے جس کا تمام بنی نوع انسان سے مطالبہ ہے۔ ان معانی میں اسلام اللہ کا پسندیدہ دین ہے: ''ان الدین عنداللہ الاسلام''۔ غیر اسے اپنی ذات میں سب کچھ سمیٹ لینے کا نام دیں گے۔ جیسا کہ ابراہیمؑ سے موسیٰؑ تک تمام یہودی انبیاء کو اسلامی سلسلہ میں منسلک کرنے سے ظاہر ہے۔

اخلاقیات کے حوالے سے اسلام کسی جغرافیائی سرحد پر نہیں رکتا۔ ایک رومانوی کمیونسٹ کی حیثیت سے کیوبا کے انقلابی چی گویرا (۱۹۲۸-۶۷ء) نے ایک مرتبہ کہا تھا: ''ہم اپنی مثال برآمد نہ

کرنے کا وعدہ نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ بنیادی طور پر اخلاقی ماڈل ہے۔ اور اخلاقی ماڈل سرحدوں سے آشنا نہیں ہوتے۔'' یہ بات بعینہ اسلام پر بھی لاگو ہوتی ہے کیونکہ یہ اپنے آپ کو متبادل اخلاقی رویہ قرار دیتا ہے۔

یہ حقیقت ابتدا ہی میں مسلمانوں پر واضح تھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط سے یہ بات واضح ہے جن کے ذریعے ۶۲۸ عیسوی میں آں جنابؐ نے مدینہ کے نواح میں تمام قبائلی سرداروں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی[۱۴]۔

خطوط کی اس مہم سے اسلام کی بین الاقوامیت کا آغاز ہوا۔ مسلمانوں نے جغرافیائی خطوں میں دنیا کو مزید تقسیم نہیں کیا بلکہ عالم گیریت کی صحیح روح کے مطابق انہوں نے ساری دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا یعنی: اسلامی دنیا (دارالاسلام) اور وہ دنیا جو ابھی اسلام نہیں لائی (دارالحرب)۔

نظریاتی اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں نے آغاز ہی میں یہ جان لیا تھا کہ اسلام عالمگیر مذہب ہے اور باقی دنیا کی صورت حال محض عارضی ہے۔

چودہ سو برس سے مسلمانوں کا پختہ عقیدہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، جس پر ۱۴۰۰ قمری سالوں کی تاریخ شاہد ہے۔ اس عقیدے کی روشنی میں وہ فوکویاما کی طرح یہ تو نہیں مان سکتے کہ تاریخ اپنے اختتام کو پہنچ گئی لیکن وہ مذہبی تاریخ کے خاتمے میں ضرور یقین رکھتے ہیں[۱۵]۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جس سے سیموئیل ہنٹنگٹن ہی نہیں بہت سے دوسرے مغربی لوگ بھی چونک اٹھیں گے۔

بلاشبہ ہنٹنگٹن نے اسلام کا اس پہلو سے جائزہ لیا ہے کہ یہ نظریہ اسلام کے دوسرے مذاہب کے ساتھ تصادم کا تصوراتی خطرہ ہی نہیں، بلکہ جس غیر معمولی رفتار سے اسلام دنیا میں ایک بار پھر پھیل رہا ہے، یہ خطرہ حقیقت کا روپ بھی دھار سکتا ہے۔

اسلام جو اپنے مزاج اور ترکیب کے اعتبار سے ایک عالمگیر مذہب ہے کبھی دنیا کے ایک محدود حصے کے سوا حکمرانی قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اسلامی دنیا سپین اور مراکش سے ہندستان، انڈونیشیا اور وسط ایشیا تک ہی پھیلی۔ اور اس علاقے کے مسلمان بھی نوآبادیاتی دور میں تاریخ کا غیر اہم موضوع بن کر رہے۔ نہ وہ پوری طرح محکوم تھے نہ ان کا کوئی فعال کردار تھا[16]۔

اگر اس تاریک زمانے کو نگاہ میں رکھا جائے جس میں صدیوں تک مسلم دنیا کو زوال، جمود، ناامیدی، دروں بینی اور محکومی کی زندگی گزارنی پڑی تو حالیہ احیاء کا عمل ایک معجزے سے کم معلوم نہیں ہوتا۔ شاہ ولی اللہ، محمد عبدالوہاب، الافغانی، محمد عبدہ، محمد اقبال، محمد اسد، ابوالاعلیٰ مودودی، حسن البناء، اور سید قطب جیسے صاحب عزیمت افراد کی کوششوں سے گزشتہ برسوں کے دوران تیزی سے احیاء اسلام کا عمل وجود میں آیا ہے۔

اسلامی تاریخ میں پہلی بار بطور مذہب تجدید اسلام کی تحریکیں اٹھائی گئیں، جن کی قیادت بیشتر مذہبی علماء نے نہیں، مغرب میں تعلیم یافتہ حکماء نے کی اور انہوں نے اسلام کو ایک جدید آئیڈیالوجی کے روپ میں پیش کیا۔

مسلم دنیا میں تحریک احیا ایک ایسے موقع پر چل رہی تھی، جب مسلمانوں کی بڑے پیمانے پر مغربی یورپ اور امریکہ کی طرف نقل مکانی ہوئی اور مواصلات میں ترقی شروع ہوئی۔ ان حالات کا نتیجہ ہے کہ اسلام جو ہمیشہ سے عالمگیر آدرش رکھتا ہے، دنیا میں پہلی بار بیسویں صدی میں فی الواقع عالم گیر بن گیا۔ اس وقت یورپ میں ۳ کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ لاس اینجلس، نیویارک، لندن، پیرس، برسلز، ویانا، روم اور زغرب جیسے مقامات پر بڑی بڑی مساجد تعمیر کی جا چکی ہیں اور انٹرنیٹ پر اسلام پوری طرح موجود ہے۔

اس پس منظر میں سیموئیل ہنٹنگٹن کا یہ خدشہ درست ہے کہ مغرب میں اس ثقافتی دھچکے کا ناخوشگوار ردعمل ہوگا اور اس لیے وہ مطالبہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کی نقل مکانی کو محدود کیا جانا چاہیے۔

اس معاملے میں پاکستان کے ایک عظیم دوست اور سیاسیات کے پروفیسر امریطس رالف بریبانتی (Ralph Braibanti) جو ہنٹنگٹن کے رفیق کار بھی رہے ہیں، بہت پرامید ہیں، اس لیے کہ ان کے خیال میں کیتھولک چرچ سمیت مسیحی چرچوں اور اسلام کے درمیان یقیناً مفاہمت اور قربت پیدا ہوگی۔ ان کی رائے میں مذہب کے بنیادی اصول، الوہی قوانین کا مشترک احترام، اور مشترکہ معاشرتی و اخلاقی اقدار ایک مشترکہ مسیحی-مسلم پلیٹ فارم کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو نہ صرف اختلافات کو حل کرنے کا ذریعہ بنے گا بلکہ مغربی دنیا کا تحفظ بھی کرے گا۔ بریبانتی کے نتائج فکر اتنے حیران کن ہیں کہ میں ان کا پورا حوالہ پیش کرنا چاہوں گا: ''تاریخ کے اس مرحلے پر اسلام کی حرکیات اور واضح اقدار میں وہ صلاحیت و امکانات موجود ہیں جو دنیا کو اخلاقی انحطاط سے نکال کر بنی نوع انسان میں نئی روح پھونک سکتے ہیں۔ موجودہ تہذیب ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہے جو صرف اسلامی اقدار ہی کے لیے خطرے کا باعث نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کو اس سے خطرہ لاحق ہے جو انسان کی باطنی زندگی میں یقین رکھتے ہیں۔ روح انسانی کے ہویدا پہلو محصور ہو چکے ہیں۔ اگر اسلام اپنے نظام اقدار کا رشتہ غیر اسلامی دنیا کی اسی نوعیت کی اقدار سے جوڑ سکے اور معاشرے پر اثر انداز ہو سکے تو سمجھئے کہ اس نے قرآن کریم میں بیان کردہ اپنا ہدف پالیا۔[17]''

تہذیبوں کے تصادم کے موضوع پر اپنے لیکچر کو انجام تک پہنچانے کے لیے حرف آخر کے طور پر میرے پاس اس سے بہتر الفاظ نہیں۔

حواشی

1. Samuel Huntington, "The West: Unique, Not Universal", *Foreign Affairs*, Vol. 75, No. 6, Winter 1996, pp. 28 - 41.
2. Asad, Talal, Interview, *Jordan Times*, Amman, Jordan, 22 July, 1997, p. 97.
3. Samuel Huntington, "The West: Unique, Not Universal"..., p. 30 .

۴۔ایضاً،ص ۳۸

۵۔ایضاً،ص ۳۷،۴۰،۴۱

6. Salvatore, Armando,*Islam and the Political Discource of Modernity* Reading, U.K. 1997, p. 73.

۷۔ایضاً،ص ۱۰۲،۱۲۱

8. Said, Edward,*Covering Islam,* London 1981, p. 15.

9. Shaheen, *The TV Arab,* Bowling Green, Ohio, USA, p. 13.

10. Senocak, Zafer, "Zwischen Orient und Okzident"*Die Zeit,* Hamburg, Germany, 26 May, 1995, p. 55.

۱۱۔ایضاً

12. Samuel Huntington, "Noch ist der Westen nicht verloren", Interview, *Die Welt,* Hamburg, Germany, 28/29 June, 1997, p. 48.

13. Al-Quran 3:19

۱۴۔تفصیل کے لیے دیکھیے:

14. Ibn Ishaq,*The Life of Muhammad, transl. A. Guillanme,*Oxford 1955, pp. 652-659.

15. Mazrui, Ali A. "Islam and the End of History"*American Journal of Islmaic Social Sciences,* Herndon, VA, Vol. 10, no. 4, Winter 1993, p. 513.

۱۶۔ایضاً،ص ۵۲۷

17. Braibanti, Ralph, "Islam and the West: Common Cause of Clash"? *American Journal of Islamic Social Sciences,*Vol. 16, no. 1, Spring 1999 p. 47.